

اسلامی سوشلزم

☆ ===== پروفیسر محمد عثمان

ہمارے ہاں اسلامک سوشلزم کی بحث گزشتہ چند ماہ میں جہاں جاذب توجہ بنی ہے، وہاں خاصی اُبھ بھی گئی ہے۔ کچھ حضرات نے نہ صرف اس کی اسی ترکیب کو قابلِ اعتراض اور خلافِ روحِ اسلام قرار دیا ہے بلکہ اس ترکیب یا تحریک کے پیچھے جو جذبہ اور فکر کام کرتا ہے، اس کی صحت و افادیت اور اسلامیت سے بھی انکار کر دیا ہے۔ ایک دو ماحولوں نے توجہ شہسبازوں میں اس کے لئے کچھ ایسے کلمات تو صیغ استعمال کئے ہیں جنہیں علمی لحاظ سے خلافِ آداب اور سیاسی زبان میں غیر پارلیمانی کہا جاسکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں جو لوگ اس تحریک یا خیال کی حمایت و مدافعت میں سرگرم ہیں، وہ بسا اوقات ایسا طرزِ استدلال اختیار کرتے ہیں جو ان کے موقف کو کمزور کر دیتا ہے یا بہران کو اسلامی سوشلزم کی بجائے محض سوشلزم یا کمیونزم کا حامی و علمبردار ثابت کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب امور لبِ سیدھی سادی بات کو پیچیدہ بنانے ہی کے ذمہ دار ہو سکتے ہیں۔

پہلے میں آپ سے وہ سیدھی سادی بات بیان کرنا چاہتا ہوں جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا ہے۔ آپ رَآنِ حکیم کو الحمد سے واقف تک پڑھئے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ جس مسائل کو حضور باری تعالیٰ نے بار بار ذکر فرمایا ہے اور جن کے بارے میں جگہ جگہ ہماری رہنمائی فرمائی ہے ان میں ایک معاش کا مسئلہ بھی ہے۔ نزولِ وحی کے بالکل ابتدائی زمانے کی بہت سی سورتوں میں غریبوں اور مسکینوں کو کھانا کھلانے اور یتیموں اور محتاجوں کی ضروریات کی دیکھ بھال کو بنیادی اور فیصلہ کن نیکی قرار دیا گیا ہے۔ ذرا آگے چل کر دولت مندوں اور فسی استعانت لوگوں کو یہ بتایا اور سمجھایا گیا ہے کہ تمہارے مال و دولت میں غریبوں کا ایک واضح حصہ ہے اور یہ حصہ بہ طور حق کے ہے۔ پھر مسلمانوں کو صدقہ و خیرات کی جا بجا تلقین کی گئی ہے اور خدا کی راہ یعنی رفاہِ عامہ پر خرچ کئے بغیر شے کا حصول ناممکن قرار دیا گیا ہے۔ زکوٰۃ پر جو زور قرآن حکیم میں ہے وہ ہر مسلمان اور قرآن خواں پر روشن ہے، بیسیوں مقامات پر جہاں

مسوۃ کتبتین دہکد جنہ اس کے ساتھ ہی فریضہ زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم ہے۔ ان احکام کے ساتھ سود کی نہایت سختی سے ممانعت کی گئی ہے تاکہ روپے پیسے والے غریبوں کو لوٹنے کی نفسیات سے متبرک رہیں۔ ایک جگہ بن لڑائی کئے ہاتھ اٹھانے والے مالہ غنیمت کو غریب میں تقسیم کرنے کا حکم ہے اور اس حکم کی حکمت یہ بیان کی ہے کہ دولت صرف دولت مندوں کے درمیان ہی نہ رہ جائے۔

ان سب احکام و طریقین اور تاکید و تحریک کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اجتماعی مفاد میں دولت خرچ کرنے اور غریب کی مدد پر ایسے آمادہ و مستعد ہوئے کہ استطاعت کے مطابق خرچ کرنے کے باوجود ان کا ذوق انفاق مطمئن نہ ہوتا تھا اور وہ رسول کریم سے دریافت کرتے تھے کہ مزید کیا اور کتنا خرچ کریں۔ اس پر یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی کہ اپنی ضروریات سے جو کچھ بچتا ہے، چاہو تو سب کا سب رناتو عامہ میں صرف کرو اور وہ یسئلونک ماذا ینفقون قتل العفرہ۔

ان احکام کی روشنی اور برکت سے جو معاشرہ تعمیر ہوا، وہ انسانی تاریخ کا ایک روشن ترین باب ہے اور اس کی جزئیات اور تفصیلات دوستوں اور دشمنوں پر ایسی عیاں ہیں کہ کسی کو محال انکار نہیں۔ مدینہ کے انصار نے اپنے مہاجر صحابیوں کے ساتھ محبت و اشتراک کا یہ ثبوت دیا کہ نہ صرف کاروبار اور گھر بار بانٹ لئے بلکہ بعض انصار نے جن کی زوجیت میں ایک سے زیادہ بیویاں تھیں انہی کسی بیوی کو اس جذبے سے طلاق دے دی کہ اس کا مہاجر بھائی اپنا گھر بسائے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابو بکرؓ کی زندگی اور دور میں اخلاص و اشتراک کا یہ جذبہ برقرار رہا۔ حضرت ابو بکرؓ نے اپنے روزمرہ خرچ کے لئے صرف اسی قدر لینا گوارا کیا جو مملکت کے غریب سے غریب مسلمان کی اوسط کمائی کے برابر تھا۔ اور جب مسلمانوں ہی کے ایک گروہ نے زکوٰۃ کے اصول اور ادارہ سے انحراف کرنا چاہا تو حضرت ابو بکرؓ نے ان کے اس فعل کو جنگ و قتل سے زیادہ سنگین خیال کیا اور منکرین زکوٰۃ کو راہ راست پر لائے بغیر دم نہ لیا۔ حضرت عمرؓ کی سادگی، ایثار، عوام سے ان کی محبت اور ان کی خبرگیری کے جذبے سے ہم سب واقف ہیں۔

امیر المومنین عمرؓ کی زندگی کے کتنے ہی واقعات یہ ثابت کرتے ہیں کہ ان کے دہر میں ہر مرد اور عورت، ہر بچے اور بوڑھے کی بنیادی ضروریات کی کفالت پر مملکت کی نگاہ تھی۔

ہم میں سے کوئی شخص اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے فوراً بعد کا مہاجر اسلامی زندگی کا بہترین نمونہ ہے، لیکن افسوس کہ جہاں انفرادی زندگی کے لئے ہم نے اُس کی طرف بار بار پلٹ کر دیکھا

اور اس سے متعدد ممبر دشمنی اور رہنمائی حاصل کی، وہاں غالباً قومی شعور کی کمی کے باعث اس کے اجتماعی اور بالخصوص معاشی پہلو سے ہم نے کچھ سبق نہ سیکھا ورنہ ہماری معاشرتی زندگی کے بہت سے ناسور صدیوں نہ رہتے رہتے یا ان کا علاج کب کا ہو چکا ہوتا۔

غلط فہمی، ملامتی یا تنگ نظری کی ادربات ہے ورنہ اگر آپ سوشلزم کی اصل اور اس کے ارتقاء پر نظر رکھتے ہیں تو آپ اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ سوشلزم کا بنیادی مفہوم سوسائٹی میں تقسیم دولت کی ناہمواری کو کم کر کے معاشرتی انصاف قائم کرنا ہے تاکہ متوتّر سے بہت فرق کے ساتھ تمام افراد کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں۔ اور کوئی ایک طبقہ نہیں بلکہ پورا معاشرہ صحت مند اور مضبوط ہو۔

اپنے اس بیان کی صداقت کے کچھ ثبوت میں آئندہ سطروں میں پیش کروں گا۔ یہاں مجھے یہ کہنا ہے کہ جہاں ہم انسان کے معاشی مسئلے کا تعلق ہے آپ غور فرمائیں کہ اسلام کے مقاصد اور سوشلزم کے مقاصد میں کس قدر اتحاد اور یکسانگی ہے۔ رسول اکرمؐ اور حضورؐ کے فوراً بعد کے اسلامی معاشرے کو اگر جدید اصطلاحی زبان میں بیان کرنا ہو تو آپ اسے بلا خوف تردید ایک سوشلسٹ معاشرہ قرار دے سکتے ہیں۔ اور قرآن حکیم معاشی مسائل میں ہمیں جو مجموعی انسانی نقطہ نظر بخشتا ہے وہ مروجہ نظام ہائے معاش میں سب سے زیادہ سوشلزم کے قریب ہے۔

②

ہمارے ہاں فکری الجھاؤ کی سب سے بڑی وجہ غالباً یہ ہے کہ واقفیت کی کمی کے باعث ہمارے حوام اور فرائض کا ایک بڑا طبقہ کمیونزم اور سوشلزم کو ایک ہی چیز سمجھتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ تاریخ کا جو مادی نظریہ، طبقاتی جنگ کا جو تجزیہ اور اس کے علاج کی جو صورتیں کمیونزم کا جزو لاینفک ہیں، سوشلزم کے اجزائے ترکیبی بھی رہی ہیں۔ لہذا وہ اسلام اور سوشلزم میں وہی مغایرت اور بُعد تصور کرتا ہے جو ان کے ایمان کی رو سے اسلام اور کمیونزم میں واقعتاً پایا جاتا ہے۔ میرے خیال میں اس زمانے میں اس سے بڑی اور انوس ناک تر غلط فہمی کوئی نہیں ہو سکتی۔

آپ سوشلزم پر کسی بھی قابل ذکر مصنف کی کوئی کتاب اٹھا کر دیکھتے یا برطانیہ یا امریکہ کے تیار کردہ نائیکو بیڈ یا رپورٹ کیجئے تو آپ کو پہلی ہی نظر میں معلوم ہو جائے گا کہ سوشلزم اور کمیونزم دو مختلف بلکہ بعض مقامات پر درمقبادہ تحریکیں ہیں اور جہاں تک کمیونزم کے تاریخی، طبقاتی اور انقلابی افکار کا تعلق ہے اکثر سوشلسٹ انکا درحقیقت ان کی ضد اور ان کی تردید پر قائم ہیں۔ بے شمار پہلوؤں سے سوشلسٹ تحریک انکی کمیونٹ

تحریک ہے۔ کمیونزم کا رُوح ہے۔ اس کا جواب ہے۔ اس کے سیلاب اور اگر آپ یہ لفظ پسند کریں تو اس کی تباہ کاری کو روکنے کے لئے اعتدال، میان روی اور تدریج کا ایک مضبوط بندھ ہے مگر یار لوگ جن بن خواندہ ذہیم خواندہ، عالم و جاہل، سخت مذہب پسند اور شدید دنیا دار بھی قسم کے لوگ شامل ہیں۔ اسے کمیونزم ہی سمجھ جا رہے ہیں۔

اپنے بیان کے ثبوت کے لئے میں انگلستان کی لیبر پارٹی اور مصر کی عرب سوشلسٹ یونین کا ذکر کروں گا، غالباً ۱۹۰۰ء کے ملک بنگ انگلستان میں یہ پارٹی معرض وجود میں آئی۔ اس کی پیشرو دو جماعتوں کے نام برٹش سوشلسٹ پارٹی اور انڈی پنڈنٹ لیبر پارٹی تھے۔ لیبر جماعت ایک باقاعدہ سوشلسٹ جماعت ہے اور سوشلزم پر اس کے رہنماؤں نے بے شمار رسالے اور کتابیں شائع کر رکھی ہیں۔ یہ جماعت اعتدال اور تدریج کے ساتھ انگلستان کے معاشی مسائل کو سوشلسٹ طریقہ پر حل کرنے کی طبع وار ہے لیکن اس کے ارکان اور رہنما الا ماشاء اللہ سب کے سب عیسائی ہیں۔ وہ تاریخ کے مادی اور جدلیاتی تصور پر ایمان رکھتے ہیں نہ وہ طبقاتی جنگ کے اس تجزیہ کو درست تسلیم کرتے ہیں جسے کارل مارکس نے پیش کیا ہے اور نہ وہ انقلابی اور غیر آئینی حربوں سے کام لیتے ہیں جو بالعموم کمیونزم سے منسوب ہیں اور جنہیں اکثر کمیونسٹ اپنی زبان اور عمل سے جلا تا مل اپنا لیتے ہیں۔ لیبر جماعت آئینی طریقوں سے، قانون سازی کے ذریعہ، جمہوری اداروں کا پورا احترام کرتے ہوئے، رائے عامہ کی تربیت کر کے اور امن و آشتی کی فضا بحال رکھ کر انگلستان کے معاشی نظام کو عوام کے حق میں مسلسل بدل رہی ہے اور گزشتہ بیس پچیس برس میں اس کی کامیاب آئینی کوششوں کو مبصرین نے ایک عظیم خاموش انقلاب سے تعبیر کیا ہے۔ انگلستان کی لیبر پارٹی ان کے اپنے دعویٰ اور طریقہ کار کی زد سے پوری طرح ایک سوشلسٹ پارٹی ہے مگر وہ مذہبی اصولوں، اخلاقیات، قدروں اور باری تعالیٰ کے وجود سے منکر نہیں بلکہ اس میں ایک بھاری تعداد شدید مذہبی رجحان رکھنے والے انگریزوں کی ہے۔

اب آپ متحدہ عرب جمہوریہ کو دیکھئے۔ اس کے آئین کی دفعہ ۵ کی رو سے مملکت کا مذہب اسلام ہے اور دفعہ ۲ کا ترجمہ یوں ہے کہ متحدہ عرب جمہوریہ ایک اشتراکی ریاست ہے جو مزدوروں، کسانوں، دانشوروں اور سپاہیوں کے اتحاد پر قائم و مثبتی ہے۔ چنانچہ صدر نامہ مصر کی سیاسی جماعت کا سرکاری نام عرب سوشلسٹ یونین ہے۔ اب اس بات سے تو کسی کو انکار نہ ہو گا کہ صدر نامہ مصر اور ان کی کابینہ کے ارکان اور ان کی عرب سوشلسٹ یونین کے لاکھوں کارکن اور قارئین (سوائے محدودے چند مصری عیسائیوں کے) سب کے سب مسلمان ہیں اور ان کو اپنی مسلمانی اتنی ہی عزیز ہے اور اس کے بارے میں وہ اتنے ہی جذباتی

ہیں جتنے کہ جم پاکستانی مسلمان۔ جذباتی سے یہاں میری مراد یہ ہے کہ اگر آپ ان کی مسلمانی میں شک کا اظہار کریں گے تو ان کا رد عمل انتہائی ناخوشگوار پائیں گے۔

عالم اسلام کا ذکر پھر کیا ہے تو یہ بیان کرنا بے محل نہ ہو گا کہ عراق میں مرحوم صدر صدام کی جماعت اور الجزائر میں ماخوذ صدر بنی اللہ کی جماعت اور ان دونوں ملکوں میں جو حکومتیں اب برسرِ اقتدار ہیں، وہ بھی اپنے اپنے ہاں سوشلسٹ ریاستیں تعمیر کرنے کے منصوبے اور منشور کی پابند اور علمبردار ہیں اور ان کی مسلمانی کو بھی شک و شبہ کی نظر سے دیکھنا ہمارے لئے کوئی محفوظ طرزِ عمل نہیں ہو سکتا۔

پھر آپ سوشلسٹ انٹرنیشنل کا وہ اعلان پڑھیے جو سالہ ۱۹۵۷ء میں فرینکفورٹ (جرمنی) کے مقام پر منعقدہ ۲۳ ملکوں کی سوشلسٹ جماعتوں کی نمائندہ کانفرنس کے بعد جاری کیا گیا تھا۔ تو آپ کو معلوم ہو گا کہ جدید سوشلزم (جس اصطلاحاً جمہوری سوشلزم کہنا چاہیے) جہاں سرمایہ دارانہ نظام سے بہت مختلف ہے اور دولت کے چند ہاتھوں میں جمع ہونے کی سخت مخالف ہے، وہاں وہ جمہوریت پر اپنے غیر متزلزل ایمان کے باعث ہر قسم کی آمریت کے، جس میں مزدوروں کے نام پر قائم ہونے والی کمیونسٹ آمریت بھی شامل ہے، شدید مخالف ہے۔ اس ضمن میں متذکرہ بالا سوشلسٹ انٹرنیشنل کے منشور کا مندرجہ ذیل پیرا دیکھ لینا کافی ہو گا۔

”کمیونزم کا سوشلسٹ روایت میں حصہ دار ہونے کا دعویٰ جھوٹا ہے۔ اُس نے درحقیقت اس روایت کو ناقابلِ شناخت حد تک مسخ کر دیا ہے۔ اور ایک ایسا تشددانہ نظریہ حیات پیدا کیا ہے جو مارکسزم کی ناقدانہ روح کے منافی ہے۔ جہاں سوشلسٹوں کا مقصد اُس استحصال کو ختم کرنا ہے جو سرمایہ دارانہ نظام میں انسانوں کو گرد ہوں میں باٹتا ہے، وہاں کمیونسٹ ایک پارٹی کی آمریت قائم کرنے کی خاطر اس طبقاتی امتیاز کو اور گہرا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔“

اپنی اس تمام گفتگو کو شیٹے ہوئے میں کہوں گا کہ جو لوگ آسانی کی خاطر باطلی کی بنا پر سوشلزم کو کمیونزم کے مترادف جانتے ہیں، شدید غلطی کے مرتکب ہیں، سوشلزم اپنے وسیع ترین معنوں میں صرف معاشی انصاف کی ایک تحریک ہے جسے کوئی بھی ملک یا کسی بھی اخلاقی یا مذہبی نظام کی حامل قوم اپنا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کے بعض ملکوں میں کبھی سوشلسٹ جماعتیں بھی ہیں۔ لیکن بیشتر ڈیموکریٹک سوشلسٹ یا سوشل ڈیموکریٹ جماعتیں ہیں جو سوشلزم اور جمہوریت کو لازم و ملزوم خیال کرتی ہیں اور قانونی اور پُر امن ذرائع سے اپنے اپنے ملکوں میں معاشی انصاف کی راہ

(THE ENCYCLOPEDIA AMERKANA)

دکا انسائیکلو پیڈیا۔ امریکانہ۔ جلد پچیسویں، صفحہ ۱۹۵۰۔

بردار کرنے میں مصروف و سرگرم ہیں اس طرح عرب ملکوں میں جو سوشلزم مقبول و رائج ہو رہا ہے اُسے کبھی عرب سوشلزم اور کبھی اسلامی سوشلزم کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں جن دو کتابوں کا چرچا عرب ملکوں کی سرحدوں سے نکل کر یورپ اور امریکہ تک پہنچا ہے، اُس میں پہلی کتاب مصر کے خالد محمد خالد کی ہے جس کا انگریزی ترجمہ FROM HERE WE START نام سے امریکہ میں شائع ہوا ہے۔ اس میں مصر کے مخصوص مذہبی اور ثقافتی روایات کے پس منظر میں سوشلزم کو تعبیر نو کے ایک نوٹر لائٹس عمل کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور دوسری کتاب شام کے نامور ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی کی اشتراکیت الاسلام ہے۔ جس میں فاضل مصنف نے اسلامی اشتراکیت کو بڑے مدلل اور دل نشیں اسلوب میں پیش کیا ہے۔ اور اسلام کے معاشی نقطہ نظر کی وہ خصوصیات نہایت تفصیل سے بیان کی ہیں جو اُسے ایک طرف کمینوزم سے اور دوسری طرف مغربی سرمایہ داری سے متین و ممتاز کرتی ہے۔

(۳)

اب اس مسئلے کو ایک اور پہلو سے دیکھئے۔ سرسید، اکبر اور حاکمی کے زمانے میں جدید فوٹو کا معاشی شعور نہ صرف ہم میں نہ ابھرا تھا بلکہ برصغیر کی دوسری قومیں بھی اس لحاظ سے کچھ بہتر نہ تھیں۔ ایشیا بھر میں یہ شعور اس صدی کے شروع میں یا زیادہ درست طور پر یوں کہیے کہ روسی انقلاب (۱۹۱۷ء) کے بعد عام ہوا۔ ہندوؤں میں اس آگاہی کا پہلا نامور نمائندہ پنڈت جواہر لعل نہرو کو قرار دیا جاسکتا ہے، لیکن ایمان داری کی بات یہ ہے کہ علامہ اقبال کو یہ شعور اور اس کی گہرائی پنڈت نہرو سے کہیں پہلے نصیب ہوئی تھی۔ اس کا ثبوت تلاش کرنا ہو تو ۱۹۰۲ء میں ان کی شائع ہونے والی کتاب ”علم الاقتصاد“ سے لے کر ان کی وفات سے چند برس پہلے چھپنے والی مثنوی ”پس چہ باید“ کے علاوہ اللہ کے متعدد اُردو اور فارسی نغموں کو دیکھئے جن کا تعلق معاشی مسائل سے ہے۔ لیکن ہمارے موضوع کے نقطہ نظر سے ان کے وہ خطوط جو انہوں نے قائد اعظم کے نام مئی ۱۹۲۶ء سے نومبر ۱۹۲۷ء تک لکھے، خاص اہمیت رکھتے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جتنی تشویش ان کو مسلمانوں کے سیاسی اور ثقافتی مستقبل کی طرف سے تھی، اُسی قدر وہ ان کے معاشی پس ماندگی کے باعث فکر مند تھے۔ ۲۱ جون ۱۹۲۷ء کے خط میں ۱۹۲۵ء کے آئین پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

”مزید برآں یہ دستور تو اس معاشی تنگ دستی کا جو شدید تر ہوتی جا رہی ہے کوئی علاج ہی نہیں۔“

اور پھر نہایت عمدگی سے فرماتے ہیں:-

”فرقہ دارانہ فیصلہ ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی ہستی کو تسلیم تو کرتا ہے لیکن کسی قوم کی سیاسی ہستی کا ایسا اعتراف جو اس کی معاشی پس ماندگی کا کوئی حل نہ بخوڑ کر تا ہو اور نہ کر سکے، اُس کے لئے بے سود ہے۔“

اور ایک دوسرے خط میں برصغیر کے معاشی مسائل کا تفصیل جاترہ لینے کے بعد اپنی سوچی سمجھی رائے کا یوں اظہار کرتے ہیں :

”اسلام کے لئے اشتراکی جمہوریت (SOCIAL DEMOCRACY) کو کسی موزوں شکل میں قبول کرنا واجب اُسے شریعت کی تائید حاصل ہو، حقیقت میں کوئی انقلاب نہیں بلکہ اسلام کی اصل پاکیزگی کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ اس اقتباس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ جو مرحلہ آگاہ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۳۸ء میں اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک برصغیر کے مسلمانوں کی جداگانہ سیاسی جہتی کا سطر دار تھا، اس کی بصیرت میں ہمارے معاشی مسائل کا حل اشتراکی جمہوریت (SOCIAL DEMOCRACY) کی ایسی موزوں صورت ہے جسے شریعت اسلامیہ کی تائید و موافقت حاصل ہو، جیسا میں نے عرض کیا شعور آہستہ آہستہ ترقی کرتا ہے۔ علامہ اقبال نے جس چیز کو ۱۹۳۷ء میں ”اشتراکی جمہوریت کی موزوں صورت“ سے تعبیر کیا بعد میں قائد اعظم اور بالخصوص مرحوم لیاقت علی خان نے اُسے باقاعدہ اسلامک سوشلزم (ISLAMIC SOCIALISM) کا نام دیا۔ طوالت کے خوف سے میں اپنی خواہش کے باوجود یہاں قائد اعظم اور مرحوم لیاقت علی خان کی تقریروں کے وہ حصے درج نہیں کرتا جو توجہ سرمایہ داری کی شدید مذمت میں اور اسلام کے اندر جو اشتراکیت پائی جاتی ہے، اُس کی حمایت میں لکھے گئے ہیں۔ ایسا کرنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ خود صدر ایوب نے ہمارے میسرے پانچ سالہ منصوبہ کے مطبوعہ خاکے کے پیش لفظ میں اسلامی سوشلزم کو اپنی معاشی منزل قرار دے کر اور اس کی نہایت عمدہ اور درست وضاحت کر کے، میرے نزدیک اس سوال پر ایسا دا شکات اور حتمی بیان دے دیا ہے کہ اس کے بعد قومی سطح پر کسی معقول اختلاف اور علمی نزاع کے گنجائش باقی نہیں رہتی۔ صدر ایوب مذکورہ پیش لفظ میں فرماتے ہیں :

”معاشی اور سماجی میدانوں میں ہماری تمام کوششوں کا منہ تائے مقصود پاکستان میں اسلامی سوشلزم کے حصول کی طرف تیزی سے آگے بڑھنا ہی ہو سکتا ہے۔ اسلامی سوشلزم کی اصطلاح تقریباً ”رفاہی ریاست“ کا بدل ہے۔ البتہ معروف رفاہی مقاصد کے علاوہ اسلامی سوشلزم کے مفہوم میں یہ بھی شامل ہے کہ معاشی ترقی کی بے محابا دوڑ میں ملک کے ثقافتی اور مذہبی ورثے کو برباد نہ ہونے دیا جائے بلکہ اُسے قائم و برقرار رکھا جائے۔ لہذا یہ تصور رفاہی ریاست سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور فرد کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے۔

”اسلامی سوشلزم کے قیام کی اساس دولت کی مساوی تقسیم پر نہیں بلکہ سب کے لئے مساوی

مواقع کی فراہمی پر ہے۔ درحقیقت آمدنیوں میں مکمل مساوات تو کہیں بھی ستے کہ کیونٹ ملکوں میں بھی حاصل نہیں ہوئی ہے کیوں کہ اگر افراد برابر کے مواقع سے آغاز کریں جب بھی مزاج اور استعدادوں کے اختلاف کے باعث آمدنیوں کا فرق ناگزیر ہے۔ اور ایسا ہونا بھی چاہیے۔ جو بات ضروری ہے یہ ہے کہ ہر فرد کو اپنی فطری صلاحیتوں کو ترقی دینے کا پورا پورا موقع ملنا چاہیے اور کوئی غیر منصفانہ معاشی یا سماجی نظام اس کی راہ میں حائل نہیں ہونا چاہیے۔

”لہذا ہماری قطعی پالیسی ہوگی کہ آمدنی اور دولت کو چند ہاتھوں میں غیر معمولی طور پر اکٹھا ہونے سے روکیں اور معاشی مواقع کو وسیع پیمانے پر تقسیم کریں اور سبھی کا رو بار کو اس طرح ضابطے میں لائیں کہ تمام معاشرے کو اس سے فائدہ پہنچے۔“

اگر کوئی سوال کرنے والا مجھ سے پوچھے کہ اسلامی سوشلزم کیا ہے تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جواب میں میں صدر ایوب کے ان الفاظ سے نہ ایک لفظ کم کہنا چاہوں گا اور نہ ایک لفظ زیادہ۔ میرے نقطہ نظر سے جس اسلامی سوشلزم کی پاکستان میں اس مرحلہ پر ضرورت ہے اس کو بہت عمدہ، نہایت واضح اور کمال درستی کے ساتھ صدر ایوب کے مذکورہ پیش لفظ میں پیش کر دیا گیا ہے۔ اب ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ وہ میں اس احساس کو سرکاری اور غیر سرکاری ذرائع سے بیدار کیا جائے جس کی توانا بیداری کے بغیر یہ ذمہ داران (یعنی اسلامی سوشلزم کے نصب العین کی طرف سے ہم پر عائد ہونے والی ذمہ داری) کما حقہ پوری نہیں ہو سکتی۔

(۴)

اب میں اس سوال کو لیتا ہوں کہ کیا اسلامی سوشلزم کی ترکیب روح اسلام کے خلاف ہے۔ اول تو آپ اسی بات پر غور فرمائیے کہ ہمارے بہترین دماغ اور ہمارے نہایت مخلص اور بیدار مغز قائدین جو اس وقت عالم اسلام میں موجود ہیں یا جو ابھی ابھی ہم سے رخصت ہوئے ہیں، انہوں نے پورے یقین و اعتماد اور کمال بصیرت کے ساتھ اس خیال اور ترکیب کو اختیار کیا ہے۔ اس فہرست میں علامہ اقبال، قائد اعظم محمد علی جناح، مرحوم لیاقت علی خان، صدر ایوب، صدراصر، عراق کے مرحوم صدر عارف، الجزائر کے سابق صدر بن اللہ کے اسلام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ جیسا میں نے اوپر بیان کیا ہے مصر، شام، لبنان، عراق، اردن، شام اور بھارت کے بیسیوں اہل نظر مسلمان اس تحریک اور ترکیب کے حامی اور علم بردار ہیں۔ ہمارے ہاں کے

علماء اور ارباب فکر میں مولانا عبد اللہ سندھی، چوہدری افضل حق مرحوم، خلیفہ عبدالحکیم مرحوم اور مولانا حسرت موہانی کی تحریریں اس نقطہ نظر سے توجہ اور التفات کے قابل ہیں۔

یہاں میں ایک دلیل اور دینا چاہتا ہوں۔

اسلامی تاریخ کے چودہ سو سال اس بات کے شاہد ہیں اور ہر زندہ اور دیر پا تحریک کے لئے یہ طرز عمل ناگزیر ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ نسل انسانی کے احوال میں جو تبدیلیاں آتی ہیں اور جس قسم کا شعور کسی عہد میں بہ طور خاص ابھرتا ہے اور جس قسم کے ذہنی اور معاشرتی تقاضے کسی دور میں بنیادی اہمیت اختیار کرتے ہیں، بقا کی آرزو مند تحریک ان کا خصوصی فوٹس لے اور اپنی تعلیمات کے اُس پہلو کو نمایاں طور پر سامنے لائے جو اُس دور کے تقاضے اور شعور کو مطمئن کر سکتا ہو۔ اگر کوئی مذہب یا تحریک ایسا کرنے میں ناکام رہے اور اپنی تعلیمات کے پیش کرنے میں عہد شناسی اور دور بینی کا ثبوت نہ دے تو وہ مذہب یا تحریک آئینِ فطرت کے مطابق انہی موت مرجاتی ہے۔ اسلام اس لئے ایک زندہ اور جادواں مذہب ہے کہ وہ اپنی تعلیمات کی ہمہ گیری کی بدولت ہر عہد کی ضرورت اور ذوق کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا اور اپنی اس صلاحیت کی وجہ سے وہ منسوخ و مدہ (OUT OF DATE) نہیں ہوتا۔

ام سب اس سے واقف ہیں کہ اٹھارویں اور بالخصوص انیسویں صدی میں جب انسانی شعور جمہوری ندرتوں اور اداروں کا گرویدہ اور پرستار ہوا تو مسلمانوں کے بہترین دماغوں نے صدیوں تک بادشاہت کا دور دیکھنے کے باوجود یہ دعویٰ کیا کہ اسلام کا سیاسی نظام آمریت یا بادشاہت کی نسبت جمہوریت کے زیادہ قریب ہے اور یہ حقیقت ہے کہ قرآن نے ”شورعی“ کا جو اصول کار میں دیا ہے اور خلافتِ راشدہ کا جو طوطی کار تھا، اس میں جمہوریت کی روح کام کرتی تھی۔ لہذا باوجود اس کے کہ دوٹو ڈلنے کا طریقہ، پارلیمنٹ بنانے کا ڈھنگ اور پارلیمانی حکومت کے بے شمار دوسرے پہلو قرآن حکیم میں بیان نہیں ہوئے، نہ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں وہ مرفی علم و عمل میں آئے، تاہم جمہوریت کی روح اور اصل چونکہ اسلام میں موجود تھی، اس لئے اس پر زور دینے میں ہم حق بجانب تھے کہ اسلام کا سیاسی نظام جمہوری ہے۔

ای طرح اگرچہ ہم صدیوں تک جاگیر داری کا شکار رہے ہیں اور کچھ عرصہ سے بعض اسلامی ملکوں میں مزاح داری کا بھی جڑ بچڑ رہی ہے تاہم جب بالآخر نسل انسانی کا معاشی شعور جاگ اٹھا ہے اور ہر طرف معاشی انصاف اور معاشی ناہمواریوں کے خلاف آواز بلند ہو رہی ہے اور مشرق و مغرب میں کروڑوں انسان دن

مات معاشی انصاف اور معاشری عدل قائم کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں اور یہ دُھن لوگوں کی سب سے بڑی 'دُھن' اور شعورِ نسلِ انسانی کا سب سے گہرا شعور اور یہ تقاضا نوٹِ بشر کا سب سے حساس تقاضا بن گیا ہے، ہم اس پیشِ نظر میں جب قرآن حکیم پر ایک نظر ڈالتے ہیں اور رسولِ اکرم صلعم کا عہدِ مبارک اور خلافتِ راشدہ کا مقدس دُور نگاہوں میں لاتے ہیں تو ہماری خوشگوار حیرت کی کوئی حد نہیں رہتی جب ہم پر یہ منکشف ہوتا ہے کہ یہ تعلیم اور یہ دُور جسے ہم بے شمار اور پہلوؤں سے مثالی جانتے تھے، معاشی انصاف اور مالی وسائل کی منصفانہ تقسیم کے اعتبار سے اور بھی مثالی اور حیاتِ آفریں ہے۔ اور لا محالہ ہمارے دلوں میں یہ تڑپ پیدا ہوتی ہے کہ اس دُور میں ہم اسلامی تعلیمات کے اس پہلو پر خصوصی زور کیوں نہ دیں، اسلام کے معاشی نقطہ نظر کو نمایاں کیوں نہ کریں، اور اگر سو سچاس سال پہلے اسلام کو جمہوریت کہنا یا اسلام میں موجود جمہوریت پر زور دینا اسلام کی بہترین خدمت اور سچائی کا موزوں ترین اظہار تھا تو آج اسلام کی اشتراکیت یعنی اسلامی اشتراکیت پر زور دینا کیوں نہ کر اسلام کی بہترین خدمت اور سچائی کا بہترین اظہار نہیں ہو گا۔ آئین بقا کا تقاضا ہے کہ یوں کیا جائے جو لوگ 'اسلامی جمہوریت' یا 'اسلامی اشتراکیت' جیسی ترکیبوں پر اعتراض کرتے ہیں وہ چھینکوں پر نگاہ جمانے والے اور مغز سے صرفِ نظر کرنے والے ہیں۔

★★★